بیع مؤجّل کے مسئلے میں

مولانا محمد طاسین صاحب اور مولانا بنوی صاحب کا علمی مناقشہ!

اہلِ علم کے لئے ایک صدائے درد

—— محمد سعید الرحمٰن علوی ——

© rasailojaraid.c

محترمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر نگرانی و ادارت دو علمی ماہنامے بڑی باقاعدگی سے چل رہے ہیں' ماہنامہ "میثاق" اور ماہنامہ "حکمت قرآن" —— کچھ عرصہ "میثاق" کے ادارۂ تحریر میں احقر کا بھی نام شامل رہا جبکہ "حکمت قرآن" میں احقر ایک عرصہ "بصائر و عبر" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھتا رہا۔ ویسے بھی کبھی کبھار اس سعادت سے بہرہ ور ہوتا رہتا ہوں۔ آج جب یہ سطور قلم بند کر رہا ہوں تو عجیب مشکل حالات کا شکار ہوں' ایک طرف مسلسل صحت کی خرابی کا مسئلہ' دوسری طرف انتہائی مشکل اور گھمبیر مسئلہ۔ تیسری طرف جن دو اصحاب علم کی تحریروں کا جائزہ لینا مقصود ہے ان میں سے ایک میرے لئے بے حد قابلِ احترام بزرگ ہیں تو دوسرے کرم فرما اور مہربان دوست۔ لیکن چونکہ معاملہ دین کا ہے' انسانیت کا ہے اور بعض بنیادی مسائل کا ہے' اس لئے یہ زہر پینے کا حوصلہ کر رہا ہوں۔

ایک مسئلہ ہے کہ "ادھار چیز نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت" کیا ہے؟ اس حوالہ سے معروف عالم مولانا محمد طاسین زید مجدھم کا ایک مقالہ ماہنامہ میثاق لاہور کی اشاعت مجریہ جنوری ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تو اسی ماہ کے "حکمت قرآن" میں ایک مقالہ مولانا مفتی محمد سیاح الدین کاکا خیل رحمہ اللہ تعالیٰ کا شائع ہوا۔ مولانا محمد طاسین سے ڈاکٹر صاحب کے حلقے کے احباب اور ان دو رسائل کے قاری بہت اچھی

© rasailojaraid.c

طرح واقف ہیں۔ ہزارہ کے نوزائیدہ ضلع ہری پور کے باسی مولانا نے تعلیم و تدریس کی زندگی کا ایک حصہ یوپی کے معروف شہر امروہہ میں گزارا تو تقسیم کے بعد اب برابر عروس البلاد کراچی کے قدیم علاقہ ٹاور کی ایک قدیم وضع کی بلڈنگ کے ایک حصہ میں اس طرح بیٹھے ہیں کہ وہ ہیں اور ذخیرۂ علم۔ علوم و فنون کے مختلف شعبوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کا ایک امتیاز یہ ہے کہ معاشیات کے حوالہ سے ان کی نظر بڑی دور تک جاتی ہے۔ معاشیات کے قدیم و جدید فلسفوں' ان کی کلیات اور جزئیات پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس میں کوئی خرابی کی بات نہیں اگر میں یہ کہوں کہ معاشیات جیسے خشک موضوع پر ہمارے قدیم علمی طبقہ میں سے بہت کم حضرات کی نظر ہے۔ ایسے میں مولانا جیسے افراد کا وجود واقعی ایک سرمایہ ہے' اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ مولانا مفتی سیاح الدین" معروف علمی و روحانی کاکا خیل قوم کے چشم و چراغ تھے۔ دیوبند کے مایہ ناز علمی فرزند ہی نہیں وہاں تدریس و افتاء کی خدمت بھی سرانجام دیتے رہے۔ میرے آبائی قصبہ بھیرہ ضلع سرگودھا کے معروف علمی ادارہ دارالعلوم عزیزیہ میں بھی ایک مدت تک خدمات سرانجام دیتے رہے اور تقسیم ملک کے بعد کا بڑا حصہ فیصل آباد میں گزارا۔ قرآن و حدیث کے ساتھ فقہی علوم پر ان کی گہری نظر تھی۔ چند سال قبل ایک سفر کے دوران اپنے اکلوتے فرزند سمیت شہادت کی موت سے ہمکنار ہو گئے اور علمی دنیا میں بڑا خلا واقع ہو گیا۔ احقر کے دادا جان سے ان کی دوستی تھی تو ابا جان سے بزرگانہ تعلق۔ اس لحاظ سے وہ میرے لئے انتہائی قابل احترام تھے اور میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور استفادہ کرتا۔

ان ہر دو بزرگوں کا نقطۂ نظر ایسا تھا جو روایتی علماء کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ بعض دوسرے بزرگوں نے بعض دوسرے رسائل میں بالخصوص مولانا محمد طاسین صاحب کا تعاقب کیا۔ لیکن ان سے اس وقت سروکار نہیں' اس وقت تو معاملہ ہے محض اپنے فاضل دوست مولانا الطاف الرحمٰن بنوی کا' جن کی ایک تحریر مولانا محمد طاسین کے تعاقب میں ماہنامہ حکمت قرآن کی اشاعت اگست ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی' لیکن اس طرح کہ مولانا طاسین کا جوابی مقالہ بھی ساتھ تھا۔ یعنی مولانا الطاف الرحمٰن صاحب کی تحریر ادارہ نے مولانا طاسین صاحب کو ارسال کر دی اور مولانا نے اس کا مختصر جواب لکھا۔ حکمت قرآن کی اگست ۹۲ء کی اشاعت میں لگ بھگ ۹ صفحات کا مقالہ مولانا بنوی کا ہے تو اتنے صفحات

© rasailojaraid.com

پر مولانا کا جواب ہے۔ مولانا بنوی کی اس سے تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے ایک مفصل تحریر مولانا کے جواب میں لکھی جو حکمت قرآن کی اشاعت دسمبر ۹۲ء اور جنوری ۹۳ء میں (دو اقساط میں) شائع ہوئی۔ لگ بھگ ۴۴ صفحات پر مشتمل مولانا بنوی کی اس تحریر میں کاروباری طبقہ کو کھلی چھٹی دی گئی ہے کہ وہ نقد و ادھار کی قیمتوں میں جتنا چاہیں تفاوت کر سکتے ہیں۔ کاروباری طبقہ کے لئے تو یہ مضمون نعمتِ غیر مترقبہ ہے کہ انہیں خوب کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں کاروبار کریں، ان کے لئے کوئی رکاوٹ یا پابندی نہیں۔

میرے لئے ایک انتہائی محترم بزرگ کا حکم تھا کہ میں ان تحریروں کا ناقدانہ جائزہ لوں اور دیکھوں کہ اصل پوزیشن کیا ہے؟ لطف کی بات یہ ہے کہ میرے بزرگ مہربان نے مجھے جس دن یہ حکم دیا اس سے دو دن بعد مجھے شادی کی ایک تقریب میں شریک ہونا پڑا۔ شادی کی یہ تقریب لاہور کی بہت اہم کاروباری برادری کی تھی۔ اس برادری کے بہت سے بزرگوں اور احباب سے میری شناسائی ہے۔ اسی شناسائی کے سبب شادی میں شریک ہونا پڑا۔ چونکہ بارات مقررہ وقت سے لیٹ ہوگئی اس لئے مختلف احباب ٹکڑیوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ ایک حصہ میرے اردگرد ہوگیا۔ ان میں سے ایک عزیز نے مجھے اسی حوالہ سے سوال داغ دیا اور سوال کے ساتھ ہی بہت سے وہ اسباب گنوا دیئے جن کے پیش نظر کاروباری طبقہ ادھار کے سودے پر نقد کے مقابلہ میں قیمت بڑھانا اپنا حق سمجھتا ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ادھار کی شکل میں سرمایہ کی مارکیٹ ویلیو متاثر ہوتی ہے، قیمت وصول کرنے کی غرض سے ہمیں خود جانا پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں ہمارا وقت بھی خرچ ہوتا ہے اور ساتھ ہی کرایہ وغیرہ بھی خرچ ہوتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سودا لینے والا لے جاتا ہے اور پھر منحرف ہوجاتا ہے، گویا ساری ہی رقم ڈوب جاتی ہے۔ اس قسم کے اسباب گنوا کر انہوں نے استحقاق جتلایا اور کہا کہ اس معاملہ کے جواز میں کیا شبہ ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ ابتداء آپ کی سوال سے تھی لیکن آخر میں آپ نے فیصلہ سنا دیا، اب میرے لئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ میں سوال کا جواب دوں۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کی جیب سے زیادہ سے زیادہ مال نکالنے کی

© rasailojaraid

غرض سے کس حد تک حریص ہے اور کس طرح اس کے لئے بہانے تلاش کرتا اور اسباب ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کبھی کبھار سرمایہ ڈوب جاتا ہے کہ سودا لینے والا منحرف ہوجاتا ہے' اس کی اس لئے کوئی حیثیت نہیں کہ محض توہمات کی بنیاد پر بنیادی حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ رہ گیا معاملہ اس کا کہ سرمایہ کی مارکیٹ ویلیو متاثر ہوجاتی ہے تو متاثر ہونے کا معاملہ دو طرفہ ہے' یک طرفہ نہیں۔ سکہ کی قیمت گھٹ سکتی ہے تو بڑھ بھی سکتی ہے اور یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے۔ باقی جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ رقم کی وصولی کے لئے خود جانا پڑتا ہے اور اس عمل میں وقت کے ساتھ کرایہ وغیرہ خرچ ہوتا ہے تو محض اتنی سی وجہ سے ادھار سودے پر اس قسم کی زیادتی جو ہمارے یہاں رواج پاچکی ہے' درست نہیں۔ اس کے لئے چارجز متعین شکل میں گاہک پر ڈالے جاسکتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ سبھی ماہرینِ معاشیات اور اہلِ علم ودانش میری اس رائے کو درست مان لیں کہ چارجز کے حوالہ سے ایک خاص مقدار میں رقم گاہک کے ذمہ ڈال دی جائے لیکن یہ کہ اخراجات کے چند روپوں کے بدلے ادھار لینے والے گاہک سے ہزاروں کا نفع کمالیا جائے پرلے درجہ کی زیادتی اور اسلام کے اصول عدل و احسان کے منافی ہے۔ مقام شکر ہے کہ میری اس ٹوٹی پھوٹی گفتگو کو سائل دوست نے پسند کیا اور کہا کہ ہاں یہ صحیح طریقہ ہے اور اس کا اہتمام ہونا چاہئے۔ــــــ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اہتمام کرے کون؟ حکومتی طبقہ کو لوگوں کے مسائل کا ادراک ہے نہ شعور' وہ محض دکان سجانے کی خاطر اسلام' عدل' جمہوریت اور شرافت کی باتیں کرتا ہے اور بس۔ کاروباری طبقہ جسے ان باتوں کا لحاظ کرنا چاہئے اس کی ہوسِ مال کا جو حال ہے وہ انتہائی درجہ شقاوتِ قلبی پر دلالت کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے فرمایا گیا کہ ان کی ہوس کا علاج قبر کی مٹی ہے۔ اہلِ علم و دین کا حال یہ ہے کہ وہ مراعات یافتہ طبقوں کے بہی خواہ تو ہیں لیکن انسانیت کے مسائل کا انہیں کوئی فکر ہے نہ غم۔ گستاخی معاف' سابقہ اقوام کے مذہبی طبقات کے قدم بقدم چلنے کی روش ہمارے یہاں عام ہوچکی ہے اور غریب کا غریب رہنا اور امیر کا امیر ہونا گویا تقدیرِ الٰہی کا حصہ ہے۔ تقدیرِ الٰہی ایک واضح حقیقت ہے' اسلامی عقائد کا حصہ ہے' لیکن مرحوم ابوالکلام آزاد کے بقول انسانی حماقتوں کو تقدیر کے سر منڈھنا بھی تو درست نہیں۔ جس معاشرہ میں

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

وسائلِ رزق پر چند افراد اور محدود طبقہ کی اجارہ داری ہو اس معاشرہ کے ناروا رویوں پر ٹوکنا بلکہ اس طرزِ عمل کے خلاف جہاد کرنا علماء کا کام ہے۔ متمول حضرات کے چندوں پر "جزاک اللہ" کہہ کر ستم رسیدہ اور مفلوک الحال لوگوں کو صبر و قناعت کا سبق دینا اسلام کی تعلیم نہیں۔

تقسیم ملک سے قبل مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "اسلام کا اقتصادی نظام" کے نام سے ایک کتاب لکھی تو ہمارے مولانا مودودی مرحوم نے اپنے رسالے ترجمان القرآن (۱۹۴۱ء کی ایک اشاعت) میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے "اشتراکیوں کو خوش کرنے کی ایک کوشش" قرار دیا اور یہ تو کل کی بات ہے کہ ۱۹۷۰ء میں متحدہ پاکستان کے پہلے اور آخری جنرل الیکشن کے موقعہ پر اربابِ علم کی ایک بڑی تعداد نے ہر اس شخص کو دائرہ اسلام سے خارج اور گردن زدنی قرار دیا جو مفلوک الحال اور ستم رسیدہ طبقات کے حقوق کی بات کرتا۔ اس حوالہ سے شیخ مجیب اور ذوالفقار علی بھٹو وغیرہ تو رہے ایک طرف' جمعیت علماء اسلام کے اکابر و اعیان کو بھی اسی لاٹھی سے ہانکا گیا۔ ان کا گناہ اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ انہوں نے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور اجارہ دارانہ رویہ پر تنقید کرکے واضح کیا کہ اسلام کا نظام اقتصاد یہ نہیں جو ہمارے یہاں رواج پذیر ہے' جس میں غیر حاضر زمینداریاں ہیں' مزارعت ہے' صنعتی وسائل پر ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری ہے۔ سمگلنگ' چور بازاری' منافع خوری اور استحصال کے ہزار طریقے ہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ لوگ جنہوں نے ساری عمر مدارس میں قرآن پڑھایا' حدیث پڑھائی' فقہ کے درس دیئے اور تربیت و تزکیہ کا اہتمام کیا وہ اس "جرم" کی بنا پر کافر قرار پائے کہ وہ غریب کا نام کیوں لیتے ہیں' ہر شخص کے لئے بنیادی حقوق کی بات کیوں کرتے ہیں' کیوں کہتے ہیں کہ روٹی' کپڑا مکان تعلیم اور علاج ہر شخص کا بنیادی حق ہے ــــ گویا جو حقیقت تھی اس کا اظہار جرم بن گیا۔ فیا حسرتا!

الیکشن ہوا تو مرحوم مشرقی پاکستان میں جھاڑو پھر گیا' سبھی جغادری پٹ گئے' شیخ مجیب سب کو بہا کر لے گیا اور بالآخر مشرقی پاکستان بنگلہ دیش اور شیخ صاحب بنگلہ بندھو قرار پائے۔ ادھر مغربی حصہ میں بھٹو صاحب حکومت کے والی و وارث قرار پائے' ان میں یقیناً

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

کمزوریاں تھیں، کوتاہیاں تھیں، لیکن انہوں نے اس ملک کے ستم رسیدہ طبقات کو زبان ضرور دی تھی اور لوگوں کو کسی درجہ میں اپنے حقوق کا شعور ضرور بخشا تھا۔ انہیں ۷۷ء میں "انتخابی دھاندلی" کا شکار ہونا پڑا، جبکہ حقیقت یہ نہ تھی کچھ اور تھی۔ ان کے دورِ حکومت کا بنایا ہوا دستورِ ۱۹۷۳ء ملک کا پہلا دستور تھا جسے "اجماعِ امّت" کی حیثیت حاصل تھی۔ اور مولانا مفتی محمود مرحوم سمیت بہت سے اکابر کے بقول وہ اسلامی، وفاقی اور جمہوری آئین تھا جس کے لئے ایک اچھے ڈرائیور کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اسمبلی جس میں ملک کے ہر حصہ کے قدآور رہنما اور نمائندے تھے وہ کسی اچھے کردار کا مظاہرہ نہ کر سکی اور ملک اندھیری گلی میں پھنس کر رہ گیا۔

مرحوم ضیاء الحق جس انداز سے سامنے آئے اور جس طرح انہوں نے اسلام کے نظام کے حوالہ سے اپنے اقتدار کا تحفظ کیا اور اسے مستحکم بنایا اس کی حد درجہ شرمناک مثال "ریفرنڈم" تھا جس میں اسلام کو متنازعہ بنادیا گیا، کیونکہ سوال یہ تھا کہ اسلام چاہیے یا نہیں؟ مرحوم نے ایک شرعی عدالت قائم کی۔ اس میں جج صاحبان سمیت علماء کو شامل کیا گیا، لیکن ستم یہ ہے کہ مرحوم ایوب خان کے نافذ کردہ "فیملی لاز" کے ساتھ ساتھ مالی معاملات کے حوالہ سے بھی کورٹ کے ہاتھ باندھ دیے۔ ان کے دورِ حکومت میں یہ لطیفہ ہوا کہ انہوں نے علماء کے ایک کنونشن کا اہتمام کیا جس میں بعض علماء نے اسلامی نظام کے حوالہ سے حکومت کے رویہ پر تنقید اور نکتہ چینی کی۔ اس ضمن میں "اسلامی نظریاتی کونسل" کی کارکردگی بھی زیرِ بحث آئی۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے جو اس وقت کونسل کے چیئرمین تھے ایک اجلاس میں کونسل کی کاردکردگی کا خلاصہ پیش کر کے کونسل اور اس کے ارکان کی سرخروئی کا سامان کیا۔ انہوں نے حرفِ آخر کے طور پر عدمِ نفاذ کی کوتاہی کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیا اور صدر محترم سے جواب لینے کی بات کہی جس کا مرحوم ضیاء الحق صاحب کے پاس سوائے اظہارِ برہمی کے اور کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے بعد نظریاتی کونسل کے چیئرمین نے کونسل کی رپورٹوں کو مرتب شکل دے کر چھپوانے کا اہتمام کر دیا تاکہ خلقِ خدا آگاہ ہو سکے۔ واقفانِ راز کہتے ہیں کہ لگ بھگ تین ہزار صفحات کی تین جلدوں پر مشتمل اس ذخیرہ کا ایڈیشن بڑی مقدار میں شائع ہوا اور چیئرمین محض اراکین کونسل کو ایک ایک سیٹ دینے پائے تھے کہ سرکاری پیشانی قہر آلود ہوگئی اور

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

جب سے اب تک وہ سرمایہ کسی تہہ خانہ یا محافظ خانہ میں اپنے پڑھنے والوں کا منتظر ہے۔
مرحوم ضیاء الحق کے بعد حالات کا نیا رخ سامنے آیا تو ایک سٹیج پر اسی کونسل کے چیئرمین نظریاتی کونسل کی بجائے شرعی کورٹ میں آگئے اور وہ بھی بطور چیف جسٹس۔ اب چونکہ مالی معاملات کو نہ چھیڑنے کا عرصہ دستور بھی ختم ہوچکا تھا' اس لئے ایک فیصلہ سود جیسے منکر کے خلاف آگیا۔ بس پھر کیا تھا' حکومت پریشان ہوگئی' وہ جو اسلام کے حوالہ سے سامنے آئے تھے' جن کی پشت پر قاضی حسین احمد سے مولانا سمیع الحق تک اور مولانا عبدالستار نیازی سے پروفیسر ساجد میر تک تھے ان کی حالت دیدنی ہوگئی۔ شریعت بل کے قاتل اب اس عدالتی فیصلہ کو سبوتاژ کرنے میں لگ گئے۔ ساری دنیا کو باور کرایا جانے لگا کہ شرعی کورٹ کے فیصلہ سے ہم نمٹ لیں گے' پرواہ نہ کریں۔ اور ساتھ ہی اپنے منظورِ نظر افراد سے اپیلیں کرواکر بالآخر خود بھی اپیل کردی اور یوں حرم کی پاسبانی کے دعوے دار ایک خوفناک قسم کے منکر کے پشتیبان بن گئے۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون

© rasailojaraid

سود جیسے "منکر" کے معاملہ میں حکومتی رویہ یہ ہے تو مسلم فیملی لاز بھی اپنی سابقہ شکل میں جوں کے توں موجود ہیں۔ ایک اور المیہ جو یہاں دیکھنے میں آیا ہے اس کا تعلق "شریعت بل" سے ہے جسے دو محترم علماء نے اس وقت سینٹ میں پیش کیا جب ضیاء الحق مرحوم صدر تھے' موجودہ سربراہِ مملکت سینٹ کے چیئرمین تھے' مسلم لیگ کے صدر جناب جونیجو وزیر اعظم تھے اور موجودہ چیئرمین سینٹ مسٹر وسیم سجاد اور مسلم لیگ کے اقبال احمد خان یکے بعد دیگرے وزیر قانون رہے۔ ضیاء صاحب عام جلسوں اور اِدھر اُدھر کے بیانات میں شریعت بل کی حمایت کے لئے بڑے سرگرم عمل رہے' لیکن مسٹر بھٹو کو تختہ دار پر لے جانے سے آٹھویں ترمیم کی منظوری تک کے لئے مخلصانہ سرگرمی کا مظاہرہ کرنے والے ضیاء الحق کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے۔
ان کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت آگئی تو مسلم لیگی عمائدین نے شریعت بل کو سینٹ میں بعجلت تمام منظور کرلیا تاکہ بے نظیر کا گھیراؤ ہوسکے' لیکن بھٹو کی بیٹی نے جب اس شریعت بل کو اسمبلی میں لانے کا عزم ظاہر کیا تو اسمبلی ہی توڑ دی گئی۔ اس ضمن میں شریعت بل کے محرک مولانا سمیع الحق صاحب کا بیان ریکارڈ پر ہے۔

© rasailojaraid

لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے اہلِ علم واہلِ دین کو پی پی پی اور اس کی زنانہ قیادت سے ایک عجیب قسم کی چڑ ہے' حالانکہ ملک کی پوری تاریخ میں میاں نواز شریف اور ان کے اسلاف کے ہاتھوں اسلام کی جو درگت بنی اور اہل دین کی جو بھد اڑی اور اڑ رہی ہے اس کا وزن پی پی پی کے بے دین رہنماؤں کی زیادتیوں سے کہیں زیادہ ہے!۔

اِس وقت ملک کے حالات اس قسم کے ہیں کہ ملک میں مراعات یافتہ طبقات کی گرفت ہے' پارلیمنٹ سے عدلیہ' سیاست سے صحافت تک ہر چیز پر ان کا قبضہ ہے' کارخانے ان کے' زرعی زمینیں ان کی' بینک اور ان کے قرضے اور پھر ان کی معافی سبھی ان کا گویا ۔

محفل ان کی' ساقی ان کا' چرخِ ہفت طباقی ان کا
اوجِ بخت ملاقی ان کا' آنکھیں میری باقی ان کا

ان حالات میں ایک اہل علم کا طبقہ ایسا رہ جاتا ہے جس کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں' خیر کی توقع بندھتی ہے' لیکن گستاخی معاف اب اس طبقہ کے اندر تنگ کی وہ بلندی باقی نہیں رہی جو کبھی اس طبقہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ رسوخ فی العلم ندارد' قرآن سے آگاہی اور حدیث و سنّت کے ذخیرہ سے آشنائی نہ ہونے کے برابر۔ مدارس شخصی پلازوں اور کاروباری اڈوں میں تبدیل ہوچکے ہیں' مدارس کے ذمہ دار اور ان کی آل اولاد اللوں تللوں میں مبتلا ہے' اساتذہ اور طلبہ اسی طرح مظلوم و بے بس ہیں جس طرح دیہی معاشرہ کا کسان اور شہری معاشرہ کا مزدور۔ مدارس میں علومِ عقلیہ بالخصوص منطق و قدیم فلسفہ کا زور ہے یا پھر عبادات کی حد تک فقہی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ حالت یہ ہے کہ "علم الکلام" کے حوالہ سے ہمارے مدارس کی واحد کتاب "شرح عقائد" ایسی ہے کہ اس میں صفات باری تعالیٰ پر اتنا الجھاؤ ہے کہ الامان والحفیظ۔اور ساتھ ہی صدرِ اول کے واقعہ کربلا کے ضمن میں غالب اکثریت پر لعن طعن کی گئی ہے۔ ہمارے مرحوم مفتی محمود نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ "تفتازانی" مجھے شیعہ یا شیعہ نواز معلوم ہوتے ہیں۔ مرحوم مفتی صاحب دیوبندی مکاتب و مدارس کی تنظیم "وفاق المدارس العربیہ" کے اُس وقت سربراہ تھے۔ سیاسی حوالہ سے ان کا قد کاٹھ بڑا تھا' میں نے اس کتاب کو بدلنے کی درخواست کی اور بعض دوسری کتابوں کی نشاندہی کی' جس کی اگرچہ ضرورت نہ تھی کہ وہ خود اس سے خوب واقف

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

تھے۔ لیکن شرح عقائد کو بدلے کون؟ فقہ کے حوالہ سے ہمارے یہاں بڑا ہنگامہ ہے۔ لیکن حضرت الامام ابو حنیفہ قدس سرہ العزیز ہوں یا باقی ائمہ فقہ' ان کی اساسی خدمات کا کسی کو علم نہیں۔ حضرت الامام' ہمارے خیال میں (یہ محض عقیدت مندانہ غلو نہیں) دورِ صحابہؓ کے بعد سب سے بڑے امامِ فقہ اور اسلامک لاء کے ماہر تھے' انہوں نے اپنے مایۂ ناز عزیز شاگردوں کی ایک چالیس رکنی مجلس کو ساتھ لے کر سالہا سال تک اس ضمن میں جو اصول مرتب کئے ان کی خبر تک نہیں' جبکہ فقہی کتابوں' اور اسی طرح حدیث کی کتابوں کے ان حصّوں پر سارا سال گذر جاتا ہے جن کا تعلق عبادات کے فروعی اختلاف سے ہے۔ محدث العصر مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک عزیز نے انہیں لکھا کہ آپ کے سبق میں رفع یدین' آمین' فاتحہ اور ایسے مسائل پر زیادہ زور شور نہیں ہوتا' کیا وجہ ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ اس قسم کے اختلافات چار رکعت کی نماز میں لگ بھگ دو سو ہیں' اگر شور و ہنگامہ کرنا ہے تو دو سو اختلافات پر ہونا چاہئے' نہیں تو محض ان دو چار مسائل پر اتنا زور کیوں؟ (اکابر کے خطوط)۔ لیکن ہمارے یہاں اکثر مقامات پر ایسا ہی ہوتا ہے اور جب کوئی صاحبِ بصیرت' صاحبِ نظر اور قدیم و جدید علوم کا ماہر عالم کسی مسئلہ پر بات کرتا ہے تو بہت سے حضرات ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمارے مولانا محمد طاسین کا وہ مضمون ہے جو مزارعت سے متعلق تھا' بہت سے حضرات نے اس پر نقد و جرح کی لیکن ڈھنگ کی نہیں' بلکہ روایتی انداز سے۔ ہمارے بہت ہی کرم فرما جوان و صالح عالم مولانا الطاف الرحمٰن بنوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ یارانِ طریقت کی سوچ کا انداز کیا ہے۔

> "یوں یاد پڑتا ہے کہ میں نے مختلف اوقات میں اس کی (مزارعت والے مضمون کی) دو چار ہی قسطیں پڑھیں جن سے پہلی دفعہ مولانا (محمد طاسین) کے تعارف کے ساتھ ان کا یہ موقف بھی معلوم ہو گیا کہ وہ مزارعت کے بارے میں احناف کے جواز کے مفتیٰ بہ قول کے مقابلے میں عدم جواز کے غیر مفتیٰ بہ قول کو ترجیح دے رہے ہیں" (حکمت قرآن' دسمبر ۹۲ء ص ۸۴)

مزید فرماتے ہیں:

"غیر ظاہر الروایہ کے اختلافی مسائل میں بھی اقوالِ متردّدہ میں ترجیح کا حق ہر

© rasailojaraid.com

ایرے غیرے کو نہیں بلکہ ان اصحابِ ترجیح کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے فقہی ذوق اور وسیع خدمات کی بدولت فقاہت کے ایک خاص مقام پر فائز ہوں، چہ جائیکہ ظاہر الروایہ کی کسی اختلافی صورت میں کوئی مجتہد نہیں بلکہ ایک مقلدِ محض گذشتہ کئی صدیوں کے تمام حنفی مجتہدین کے اجماعی مفتیٰ بہ قول کو ایک نئے ناقابلِ عمل خیالی معاشی ڈھانچے کی تشکیل کے شوق میں مرجوح قرار دے۔

نواحسرتا (ایضاً، ص ۸۵)

گویا مولانا بنوی زید مجدھم جس کا تعاقب کررہے ہیں وہ "ایرا غیرا" ہے۔ "ایک ناقابلِ عمل خیالی معاشی ڈھانچے" کے غلط اور انہونے شوق کا شکار ہے اور ایک اجماعی مسئلہ (جواز مزارعت) کو نظرانداز کررہا ہے۔ اس خوبصورت اور مرصّع زبان پر تو میرا کوئی تبصرہ نہیں، لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے حکمت قرآن ہی کی کسی اشاعت میں مولانا کی کتاب بسلسلہ مزارعت پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ قرآن و حدیث کے ارشادات اور فقہائے کرام کی بڑی تعداد بشمول ائمہ اربعہ کا اس معاملہ میں ایک واضح اعلان اور سوچ ہے تو حنفیت کے نام لیوا استاذ کی بات چھوڑ کیوں دیتے ہیں؟ کیا آج کا رسوائے زمانہ جاگیردار طبقہ اور غیر حاضر زمیندار ایسا مقدس و محترم ہے کہ آج کے علماء اس سے ٹکر نہیں لے سکتے اور اس کی اجارہ داری کو چیلنج نہیں کرسکتے۔ کیا ہم اسی پر خوش ہیں کہ یہ لوگ ہمیں کسی قدر عُشر دے دیتے ہیں یا تھوڑا بہت چندہ، اس لئے انہیں چھیڑا نہ جائے۔ آخر ہمارے علماء ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتے جن پر انسانی اقدار و روایات کا مدار ہے اور سسکتی انسانیت کی بہتری ان سے وابستہ ہے؟۔

ایک مسئلہ زمینوں کی حیثیت کا ہے کہ وہ عشری ہیں یا خراجی؟ حضرت الشیخ القاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ آج کے حنفیوں سے بڑھ کر حنفی تھے اور ان کی بقامت کہتر لیکن بقیمت بہتر کتاب "مَا لا بُدَّ مِنہ" ہمارے نصاب کا حصہ ہے۔ اس میں انہوں نے واضح کردیا کہ یہاں کی زمینیں خراجی ہیں لیکن ہمارے یہاں کے علماء زبان نہیں کھولتے۔ ضیاء الحق کی شرعی کورٹ میں اس حوالہ سے رٹ دائر ہوئی اور رٹ کرنے والے نے اپنی رٹ میں اس پر دلائل دیئے لیکن عدالت نے رٹ سماعت کے لئے ہی منظور نہ کی۔ ظاہر ہے کہ زمینوں کا معاملہ خراجی کے طور پر ثابت ہوجائے تو یہ سارا سسٹم

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

بدل جائے گا اور وہ خداؤں کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی اور غریب کاشتکار کے دن بدل جائیں گے۔ لیکن ایسا ہو کیسے؟ ہم نے عرض کیا کہ علماء کا ایک طبقہ تھا جس سے خیر کی امید تھی۔ وہ تو "نظریہ ملکیت ذاتی" کا تقدس ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے اور ہر حال میں اجارہ دار طبقہ کو تحفظ دیتا ہے۔ اجتہاد کا دروازہ اس نے بند کر رکھا ہے۔ وقت کے نئے چیلنج کا جواب اجتماعی کاوشوں سے ممکن تھا' لیکن افسوس کہ ملک بھر میں علماء نے اس کا کوئی اہتمام نہ کیا۔ اہتمام کیا کرتے' ہر عالم مستقل جماعت بنا کر جلد سے جلد لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہونے کا شوقین ہے۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ ایک اجتماعی ادارہ ہوتا جس کی باگ ڈور علماء راسخین کے ہاتھ میں ہوتی۔ وہ غیر علماء ماہرین معاشیات اور ایسے ہی دوسرے متدین اور اسلامی روایات کے پابند اہلِ علم سے رابطہ کر کے' سوچ و بچار کرتے اور امت کو دلدل سے نکالنے کی فکر کرتے' لیکن فواحسرتا کہ ایسا کوئی نظم ہے نہ انتظام اور تقریباً عام رائے یہ ہے کہ اب اجتہاد کی مطلق ضرورت نہیں۔ اسی لئے تو بہت سے حضرات "فتاویٰ عالمگیری" کو جوں کا توں نافذ کر دینا ہی ضروری خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے اسلامی نظام کا مسئلہ حل ہو جائے گا' حالانکہ ۱۹۷۳ء کے اجماعی اور متفقہ آئین میں بات فقہ کی نہیں "قرآن و سنت" کی کہی گئی تھی اور معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی تدوین میں مفتی محمود' مولانا نورانی اور پروفیسر غفور احمد جیسے سکہ بند حنفی اکابر شامل تھے تو منظوری کے مرحلہ میں مولانا غلام غوث ہزاروی' مولانا عبدالحق اکوڑہ' مولانا عبدالحق بلوچستان' مولانا نعمت اللہ کوہاٹ' مولانا صدر الشہید بنوں' مولانا محمد ذاکر جھنگ' مولانا محمد علی حیدر آباد اور مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری کراچی جیسے سکہ بند حنفی اکابر پیش پیش تھے' لیکن حیرت و تعجب ہوتا ہے جب آج ہمارے اہل علم فقہ حنفی ہی نہیں فتاویٰ عالمگیری کے نفاذ کی بات کرتے ہیں اور اجتہاد کی بات آتی ہے تو اسے جدت پسندوں اور ملحدوں کا لایعنی شوق بتلاتے ہیں اور علی الخصوص معاشی مسائل کے حوالہ سے بات کرنے والے پر پل پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس معاشرہ میں جو ہو رہا ہے وہی صحیح اور درست ہے گویا "مارآہ المسلمون حسنًا فھو عند اللہ حسنٌ" جیسی روایاتِ حدیث کی بنیاد پر سرسید احمد خان مرحوم اور ان کے رفقاء کسی زمانہ میں جو باتیں کرتے اور کہتے وہی آج ہمارے علماء کہہ رہے ہیں' جس کا معنی یہ ہے کہ وہ حالات سے مفاہمت کر چکے ہیں اور جو

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

ہو رہا ہے اسی کو کافی شافی سمجھ کر اسی پر قناعت کو ضروری خیال کرتے ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتے جس سے مراعات یافتہ طبقہ کی ناراضی مول لینا پڑے اور چندوں اور نذرانوں کا بازار نرم پڑ جائے۔

مولانا محمد طاسین نے اپنے پہلے مضمون مطبوعہ میثاق جنوری ۱۹۹۲ء میں بڑی صراحت کے ساتھ متعلقہ مسئلہ یعنی نقد و ادھار کی الگ الگ قیمتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انہوں نے قرآن کا سہارا لیا، احادیثِ نبویؐ سے استدلال کیا، قابلِ احترام مفسرین کی تصریحات پیش کیں اور فقہ حنفی کی معروف کتاب "الہدایہ" کی ایک عبارت جس سے اس معاملہ کو جائز سمجھنے والے حضرات استدلال کرتے ہیں اس کا صحیح مطلب بیان کیا۔ ہدایہ کے قابل احترام شارحین کے اس معاملہ میں رویہ کا ذکر کیا اور خود صاحبِ ہدایہ کی تصریحات سے اس کو ناجائز و غلط ثابت کیا تو اس پر ہمارے ناقص خیال میں علم و منطق کے کھولے دروازے کی چنداں ضرورت نہ تھی، بلکہ حق پرستی کا تقاضا تھا کہ صحیح بات کو صحیح مان لیا جاتا اور استحصالی طبقہ جو فائدے اٹھا رہا ہے ان کا سدباب کرنے میں حق کی حمایت کی جاتی۔ اگر کل ایک بات واضح نہ تھی تو مولانا محمد منظور نعمانی کے بقول یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آج اس کی وضاحت ہو جانے کے بعد اس سے محض اس لئے صرفِ نظر کیا جائے کہ وہ کل واضح نہ تھی اور اس سے ہمارے اسلاف پر حرف آئے گا۔

مولانا نے اپنے اس پہلے مضمون میں میثاق کے ص ۵۳ پر حضرات علمائے کرام اور مفتیانِ کرام کی خدمت میں جو گذارش کی، طوالت سے بچنے کی خاطر میں اس کو نقل نہیں کر رہا۔ لیکن یہ ضرور گذارش کروں گا کہ اسے ایک بار پھر پڑھ لیا جائے۔ ہم ایک طرف بقول مولانا قرآن و حدیث کے اندر اجتماعی زندگی کے ہر مسئلہ سے متعلق تفصیلی یا اجمالی ہدایت و رہنمائی کا دعویٰ کریں، دوسری طرف کوئی مسئلہ آئے تو اس کے لئے دلائل دیں فقہ و فتاویٰ کی کتابوں سے، تو دعوے اور دلیل میں مطابقت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اسلام کی صحیح اور سچی خدمت کا یہی تقاضا ہے کہ ہم اپنا قبلہ درست کریں، اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کریں اور استحصالی طبقہ کی اجارہ داری کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔ ہمارے رویوں میں تبدیلی نہ آئی تو یہاں کے مظلوم طبقات کا ردعمل ۱۹۱۷ء کے کسی نئے انقلاب کو جنم دینے کا سبب بنے گا۔ یہ ہماری بھول ہے کہ روس ٹوٹ گیا اور سوشلزم و کمیونزم

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailejaraid.